شبِ ہجر کی پہلی بارش

نازیہ کنول نازی

قسط نمبر 2

چبھتی ہے قلب و جاں میں ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے
میں نے کبھی یہ ضد تو نہیں کی پر آج شب
اے مہہ جبیں نہ جا کہ طبیعت اداس ہے

(گزشتہ قسط کا خلاصہ)

صمید حسن کا شمار شہر کے کامیاب بزنس مین میں ہوتا تھا۔ انہیں اس مقام تک پہنچانے میں ان کی لگن کے ساتھ کرنل شیر علی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ کرنل شیر علی کی پوتی عائلہ انہی کے آفس میں کام کرتی ہے اور وہ اسے اپنی بیٹی سے بڑھ کر اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا بیٹا زاویار بیرون ملک مقیم ہے جبکہ سارہ بیگم اور پرہیان ان کے ہمراہ ہیں۔ پرہیان کو اپنے کلاس فیلو کی زبانی علم ہوتا ہے کہ وہ صمید صاحب کی بیٹی کے بجائے پرہیان عزیز ہے تو وہ مارے صدمے کے گنگ ہوجاتی ہے۔ دوسری طرف درمکنون کے بارے میں جان کر کہ وہ صمید صاحب کی بیٹی ہے رشک اور تفاخر کے جذبات اس کا احاطہ کرلیتے ہیں وہ سارہ بیگم پر اس حقیقت کا انکشاف کرکے انہیں بھی اذیت میں مبتلا کردیتی ہے۔ سدید عائلہ کی نوک جھوک سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اسے بے حد پسند کرتا ہے لیکن ابھی اعتراف کا مرحلہ طے نہیں کرپاتا۔ ان دونوں نفوس کی بدولت کرنل شیر علی کے ہاں رونق سی رہتی ہے۔ کہانی کا دوسرا اہم کردار صیام ہے گھر کا واحد کفیل ہونے کے ناطے وہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ شگفتہ اور عشرت اس کی دو بہنیں ہیں جبکہ عشرت بیوہ ہوجانے کی بنا پر چھ ماہ کے بیٹے کے ہمراہ ان کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ والد کی بیماری اسے مزید پریشانی میں مبتلا کردیتی ہے۔ وہ درمکنون کے آفس میں جاب کرتا ہے اور اس کی ذرا سی پریشانی پر بے چین ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ درمکنون کی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر وہ خود بھی بے کل ہوجاتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف درمکنون کے نزدیک اس کی حیثیت عام ورکر کے مانند ہے لیکن اس کی پریشانی جان کر والد کے علاج کے لیے وہ اس کی مدد کرنا چاہتی ہے جس پر وہ سہولت سے انکار کردیتا ہے۔ زاویار کے پاکستان جانے کا سن کر اس کے دوست ایبک اور جولی کافی حیران ہوتے ہیں ساتھ ہی ہوزان کے متعلق اس کا حتمی فیصلہ جاننا چاہتے ہیں جس پر وہ ہوزان کی محبت کو توجہ دیے بغیر انہیں صاف انکار کردیتا ہے۔ ہوزان اسٹور پر کام کرتی تھی وہیں اس کی ملاقات زاویار سے ہوئی تھی وہ اس سے مرعوب ہونے کے ساتھ رفتہ رفتہ اس سے محبت کرنے لگی تھی لیکن اس کے اعتراف محبت پر زاویار خاصا برہم ہوتے اسے اطلاع دیے بغیر چپ چاپ پاکستان لوٹ آتا ہے۔ اس کے پاکستان آنے اور بزنس سنبھالنے پر صمید صاحب نہایت خوش ہوتے ہیں۔ صمید صاحب نہایت غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے ان کے والد بچوں کے اسکول کے آگے ٹھیلہ لگاتے تھے ماں تو پہلے ہی چل بسی تھی والد بھی اپنی بیماری کے مناسب علاج نہ ہونے پر انہیں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کے نام سے زندگی کا آغاز کیا' جب ہی ان کی ملاقات کرنل شیر علی سے ہوئی تھی وہ انہیں اپنے ہمراہ گھر لے آتے ہیں۔ جہاں ان کی دو بھتیجیاں مریہ اور بریہ رہتی تھیں۔ ان کا بیٹا تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک مقیم ہوتا ہے اس دوران وہ ایک بیٹے کے فرائض ادا کرتے کرنل صاحب کا دل جیت لیتا ہے اور تعلیم بھی اس دوران جاری رکھتا ہے جب ہی کرنل صاحب کی بیماری کی وجہ سے سکندر علوی پاکستان آتا ہے اور اس دوران اس کا نکاح بریہ سے طے کردیا جاتا ہے جبکہ وہ اس رشتے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوتا لیکن کرنل صاحب کے فیصلے پر خاموش ہوجاتا ہے نکاح کے ڈیڑھ ماہ بعد وہ واپس لوٹ جاتا ہے جبکہ بریہ کی آنکھوں میں انتظار کے دیے روشن ہوجاتے ہیں۔ صمید صاحب بزنس کے حوالے سے زاویار کو عائلہ سے مدد لینے کے لیے کہتے ہیں لیکن اسے عائلہ کی اپنے بزنس اور فیملی میں مداخلت ہرگز پسند نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ تیسرے روز ہی وہ اس پر سفارش کا الزام لگاتے اس کی تذلیل کرتا ہے۔ جواباً عائلہ اپنا ریزائن لیٹر اسے تھماتے وہاں سے نکل آتی ہے اسی دوران صمید صاحب آفس میں داخل ہوتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)



وہاں میں نہیں تھی
فقط خالی پنجرہ بدن کا پڑا تھا
اور نیم واان کواڑوں سے ہر چرچراہٹ میں
حیرانیاں بولتی تھیں
زمیں کی فضا سے کسی نے مجھے باہر دھکیلا
فلک تک میری دسترس کیوں نہیں تھی
نجانے میں کب تک فضا میں بھٹکتی رہی تھی!

سرد ہوا کے تھپیڑے فضا کی خنکی میں اضافہ کررہے تھے' مگر وہ موسم کی پروا کیے بغیر پیدل ہی چلی جارہی تھی آنسو تھے کہ ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے' بار بار زاویار حسن کا توہین آمیز لہجہ' تصور میں آکر اسے مزید دکھی کررہا تھا۔ کتنے سالوں سے وہ اس کمپنی کے لیے کام کررہی تھی' بالکل ایسے جیسے وہ اس کی اپنی کمپنی ہو' پچھلے چند سالوں میں اس کی قابلیت اور محبت نے اس کمپنی کو کہاں سے کہاں پہنچادیا تھا اور آج بنا کسی قصور' کسی جرم کے' اسی کمپنی کے مالک نے ایک منٹ میں اسے اس کی اوقات یاد دلا کر رکھ دی۔ اس کا دل چاہا' وہ سڑک کنارے بیٹھ کر خوب روئے' اتنے سالوں کی محنت کا یہ صلہ' اس جیسی حساس لڑکی کے لیے موت کے مترادف تھا۔ تب ہی اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ وہ گھر پہنچی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سدید کچن میں کھڑا پیاز کاٹ رہا تھا۔ جبکہ کرنل صاحب لاؤنج میں بیٹھے اس سے ملکی حالات پر تبصرہ کررہے تھے۔ ان کے سرخ چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔ وہ بیگ گود میں رکھ کر وہیں لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ کرنل صاحب بتارہے تھے۔

"سترہ ستمبر ۲۰۰۵ء کی بات ہے آزاد کشمیر رجمنل کمانڈنٹ کے سامنے ایک عمر رسیدہ شخص صبح کے وقت' بوسیدہ لباس کے ساتھ خاموش کھڑا تھا' اشارے سے بتاتا ہے کہ وہ ڈیوٹی پر واپس آگیا ہے' بولنے سے معذور ہے' کاغذ پر لکھ کر بتاتا ہے' تین تین پانچ پانچ ایک تین نو......

سب چونک اٹھے۔

"مقبول حسین' چالیس سال بعد؟ مگر وہ تو غائب تھا' شہید سمجھ لیا گیا' مگر اس وقت سامنے کھڑے سپاہی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور تم جانتے ہو وہ سپاہی ہے مقبول حسین......" وہ خاموش بیٹھی کرنل شیر علی کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی' جب وہ بولے۔

"ستمبر ۱۹۶۵ء......سپاہی مقبول حسین' کیپٹن شیر علی کی قیادت میں ایک اہم مشن پر روانہ ہوتے ہیں' ان کے بھائی

مکھن خان' دو بہنیں' منگیتر' ان کے والد' والدہ' انہیں اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں کی چھاؤں میں خدا حافظ کہتے ہیں' یہ مشن مقبوضہ کشمیر میں دشمن کے ٹھکانوں پر حملہ کرکے اس کے اسلحے کے ڈپو اور دوسری تنصیبات کو تباہ کرنے پر مبنی تھا' تاکہ دشمن کی اس تیاری پر بروقت کاری ضرب لگائی جاسکے جو وہ پاکستان پر حملے کے لیے کررہا تھا۔ مقبول حسین شانے پر وائرلیس سیٹ اور ہاتھ میں رائفل لیے' معرکے میں اترتے ہیں۔ مشن کی تکمیل کے بعد فورس اپنے بیس کی جانب واپس آتی ہے' مگر سپاہی مقبول حسین دشمن کے فائر کی زد میں آجاتے ہیں اور دشمن کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں' جینواء کنونشن کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور انہیں جنگی قیدی بھی نہیں بنایا جاتا' نہ ہی سول قیدیوں میں ان کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے جنگی قیدیوں کے تبادلے میں بھی ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ان افراد کی لسٹ میں لکھے جاتے ہیں' جن کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ کھو گئے ہیں یا شہید ہوگئے ہیں۔

ادھر سپاہی مقبول حسین دشمن کی قید میں ایسی ایسی اذیتیں برداشت کرتے رہے کہ انسانی ظلم کی تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی...... قید تنہائی...... تنگ وتاریک دن رات...... موسموں کی سختی...... جانوروں کی طرح رینگنے کا حکم' جسمانی ایذاء کے ایسے ایسے حربے جو حیوانیت اور بربریت کی ناقابل برداشت مثالیں ہیں۔

"جواب دو...... بولتے کیوں نہیں...... بتاؤ پاکستان میں فوجی اڈے کہاں کہاں ہیں؟ تمہیں سب راز اگلنا ہوں گے بولو جو کچھ تمہیں معلوم ہے' نفسیاتی طور پر انہیں ٹارچر کیا جاتا ہے' شب و روز پٹرول پلایا جاتا ہے' خونخوار کتے چھوڑے جاتے ہیں' جوان کی پنڈلیاں چبا جاتے ہیں مگر...... وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں' ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہوتا۔

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پہ بکھر گئی ہوگی

"پاکستان زندہ باد"

اس قید خانے کی دیواریں مقبول حسین کے خون سے رنگی جاتی ہیں اور وہ ہر جگہ لکھ دیتے ہیں۔

"پاکستان زندہ باد' پاکستان پائندہ باد" تبھی ایک افسر چلاتا ہے' کاٹ دو اس کی زبان کاٹ دو اور پھر ان کی زبان بھی کاٹ دی جاتی ہے تاکہ وہ پاکستان جاکر بھی یہ نہ بتاسکیں کہ ان کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا' انہیں نفسیاتی مریض بناکر پاکستان دھکیل دیا جاتا ہے اور چالیس سال بعد وہ اس سرزمین پر لوٹتے ہیں تو ان کے استقبال کے لیے نہ گاؤں میں ان کا بھائی مکھن خان ہے اور نہ ان کے وہ دوست کہ جن کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ بس چند قبریں ہیں اور ایک حوصلہ مگر کون جانے......!

"جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا"

اور آج چالیس سال بعد سپاہی مقبول حسین نمبر تین تین پانچ پانچ ایک تین نو' پھر ڈیوٹی پر حاضر ہے' انہی کی ملکیت ہے یہ سرزمین' یہی حقیقی وارث ہیں زمین کے اس ٹکڑے کے' مگر افسوس صد افسوس کہ ان کی ایسی قابل فخر خدمات کے عوض' پاکستان کی حکومتیں اور عوام ان کے مزاروں سے جالے تک صاف نہیں کرواسکیں' قوم کے چٹانوں سے مضبوط سینوں والے جاں بازوں کے ساتھ ہی یہاں انسانیت بھی سوگئی ہے' بھوک سے بلکتے' سیلابوں اور زلزلوں کے مارے معصوم بچے' ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ڈرون حملوں میں مرتے بے گناہ شہری' مہنگائی کے بوجھ تلے دب کر لحہ بالحہ سسکتے غریب عوام اور اسی عوام کے سینے پر روزانہ کروڑوں کی شاہ خرچیاں کرتے حکمران' خود سوچو سدید' کیا مستقبل ہوسکتا ہے اس ملک

کی بدنصیب قوم کا؟" سرخ چہرے پر دبا دبا جوش اچانک غصے اور پھر شدید دکھ میں ڈھل گیا تھا۔ سدید پیاز کاٹ کر ہاتھ دھونے کے بعد کچن سے نکل آیا۔

"آپ صحیح کہتے ہیں بابا' مگر کیا کیا جاسکتا ہے' سوائے کڑھنے اور دل جلانے کے' اب مقبول حسین اور اس جیسے سینکڑوں قابل فخر جوان ملک کی قیادت سنبھال کر یہاں انقلاب تو نہیں لاسکتے ناں؟" کرنل شیر علی کی طرح اس کا دل بھی دکھی تھا۔ تبھی اس کی نظر عائلہ کی طرف اٹھی۔

"تم کب آئیں؟"

"ابھی...... تھوڑی دیر پہلے۔" اس کا لہجہ بجھا سا تھا وہ چونک اٹھا۔

"کمال ہے' پتہ ہی نہیں چلا...... آنکھوں کو کیا ہوا ہے کتنی سرخ ہورہی ہیں۔" فوراً ہی اس کی سرخ آنکھوں پر غور کرتا ہوا وہ پریشان ہوا تو عائلہ نے سر جھکالیا۔

"کچھ نہیں' صبح سے خارش ہورہی ہے' شاید انفیکشن ہوگیا ہو۔"

"چلو پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔"

"ابھی نہیں سدید' بہت تھکن فیل ہورہی ہے' سوؤں گی۔"

"یہ کون سا ٹائم ہے سونے کا' عشاء کی نماز پڑھ کر کھانا کھا کر سونا۔"

"نہیں' بھوک نہیں ہے' نماز رات میں اٹھ کر پڑھ لوں گی پلیز۔" اس کے لہجے میں بے حد تھکن تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا' وہ اٹھی اور کرنل صاحب کے گال پر پیار کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی' پیچھے وہ اور کرنل صاحب پریشانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔



جز بھی ایک پھول ہے
بس فرق صرف اتنا ہے
کہ اسے نمائش سے نفرت ہے

صمید حسن صاحب کی گاڑی کے ٹائرعین اس کے آفس کے باہر چرچرائے تھے۔ وہ بے نیاز سا بیٹھا پیپر ویٹ گھماتا رہا۔ پھر جس وقت صمید صاحب نے اس کے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا وہ فوراً سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام پاپا کی جان۔" فخریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ قریب آئے۔

"کیا ہورہا ہے؟"

"کچھ نہیں' ہمدانی صاحب کے ساتھ میٹنگ کی تیاری کررہا تھا۔"

"گڈ...... ہمدانی صاحب ہمارے بہت اچھے کلائنٹ ہیں' خاص طور پر عائلہ کی ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر ہیں۔"

"آپ کے بیٹے میں بھی لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے پاپا۔" اسے فی الوقت عائلہ کی تعریف بری لگی تھی۔ صمید صاحب اس کے لب بھینچنے پر مسکرادیے۔

"بے شک...... میں نے یہ کب کہا کہ میرے بیٹے میں کوئی صلاحیت یا خوبی نہیں ہے' الحمدللہ میرے بیٹے کی صلاحیتوں کا تو زمانہ معترف ہے۔" فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے زاویار کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اطمینان

سے مسکرادیا۔

''شکریہ پاپا۔''

''ویلکم مائی سن' کیسا لگا یہ آفس اور آفس کے لوگ؟'' اگلے ہی پل وہ اس کے مقابل سیٹ سنبھال کے بیٹھ چکے تھے' زاویار نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔

''ابھی تک تو ٹھیک ہے پاپا آہستہ آہستہ پتہ چلے گا' کہاں کہاں کیا کیا غلط ہے۔''

''ہوں' تم چاہو تو عائلہ سے مدد لے سکتے ہو' بہت قابل بچی ہے' تمہاری مما بتا رہی تھیں کہ اسے بخار ہے مگر پھر بھی وہ آفس چلی آئی۔'' اگلے ہی پل پھر سے عائلہ کی تعریف نے اس کا اطمینان غارت کردیا۔ تب ہی وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

''اس نے ریزائن کردیا ہے پاپا۔''

''وہاٹ...... مگر کیوں؟'' جتنے سکون سے اس نے بتایا تھا' صمید صاحب کو اتنا ہی شاک لگا۔ وہ لاعلمی سے کندھے اچکا گیا۔

''پتہ نہیں شاید اسے میرے ساتھ کام کرنا پسند نہیں۔''

''نہیں' ایسا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتادیتی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے' ضرور تم نے اسے تنگ کیا ہوگا۔''

''ایم سوری پاپا' میری اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کہ اسے تنگ کرتا پھروں' وہ خود ہی نہایت بدتمیز اور خودسر لڑکی ہے' خوامخواہ سر چڑھا رکھا ہے آپ نے اسے۔''

''زاویار' عائلہ میری بیٹی ہے اور میں کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری بیٹی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے' خواہ وہ میرا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔'' ایک پل میں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

زاویار کے اندر آگ جل اٹھی۔

''آپ ایک معمولی لڑکی کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کی انسلٹ کررہے ہیں پاپا۔''

''معمولی لڑکی نہیں ہے وہ' جتنا میرا بیٹا مجھے عزیز ہے اتنی ہی وہ عزیز ہے' ہمیشہ یہ بات اپنے دماغ میں رکھنا زاویار کہ تمہارا باپ اس لڑکی کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کرسکتا۔''

''چاہے وہ آپ کے بیٹے کو سرعام گالیاں دیتی رہے؟''

''وہ ایسی نہیں ہے' وہ تو چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کو تکلیف نہیں دیتی' تمہیں کیسے دے سکتی ہے۔'' بنا اس کی جلن کی پروا کیے انہوں نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا' پھر کوٹ کی جیب سے موبائل نکال کر عائلہ کو کال ملائی۔

دوسری طرف ان کی کال کو کوئی رسپانس نہیں دیا گیا تھا' تب ہی انہوں نے سدید کو کال ملائی۔

''السلام علیکم انکل کیسے ہیں آپ؟'' دوسری ہی بیل پر ان کی کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

''وعلیکم السلام' میں ٹھیک ہوں' تم سناؤ۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں آپ سنائیں کیسے یاد کیا؟''

''یاد تو ہر وقت کرتا ہوں بیٹے' اس وقت عائلہ بیٹی سے بات کرنا چاہ رہا تھا' مگر وہ کال پک نہیں کررہی۔'' بنا زاویار کی طرف دیکھے وہ بات کررہے تھے۔ جس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ پڑ رہا تھا۔

''جی انکل' وہ اصل میں کچھ ڈسٹرب ہے' شاید اس کی آنکھوں میں کچھ انفکشن ہوگیا ہے تو کمرا بند کرکے سو رہی ہے' میں آپ کا پیغام دے دوں گا اسے' وہ اٹھتے ہی آپ سے بات کرلے گی۔''

''ہوں ٹھیک ہے' کرنل صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کیجیے گا۔''

''جی ٹھیک ہے انکل۔''

''خدا حافظ۔'' کال بند کرتے ہی انہوں نے پھر زاویار کی طرف دیکھا۔

''یاد رکھنا زاویار' عائلہ اس کمپنی میں کوئی معمولی ورکر نہیں ہے' اس کمپنی کی بنیاد جن پیسوں سے رکھی گئی' وہ پیسے تمہارے باپ کو عائلہ کے دادا' یعنی کرنل شیر علی نے مہیا کیے تھے۔ وہ اس کمپنی میں اصولاً اور قانوناً بیس پرسنٹ کے شیئرز کے مالک ہیں تم اور میں دونوں چاہیں تب بھی انہیں باہر نہیں کرسکتے' سنا تم نے' میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ تم بلاوجہ اس لڑکی کا دل دکھاؤ۔'' اپنی سیٹ سے اٹھتے ایک بار پھر سے انہوں نے اسے تنبیہہ کی تھی۔

زاویار کا بس نہ چلتا رہا تھا کہ اپنا سر دیوار پہ دے مارے...... کیا تھی وہ لڑکی؟

ایک مڈل کلاس گھرانے کی' نارمل سی شکل و صورت والی لڑکی' جس کی شخصیت سے اگر ذہانت اور خود اعتمادی کو نکال دیا جاتا تو باقی صفر بھی نہیں بچتا تھا' مگر اسی لڑکی کے لیے اس کا پورا گھر یوں پاگل تھا جیسے وہ آسمان سے اتری کوئی حور ہو۔

صمید صاحب کمرے سے اٹھ کر جاچکے تھے۔ پیچھے وہ کھولتے خون کے ساتھ' میز پر زوردار مکا رسید کرکے رہ گیا۔



سورج ڈوب چکا تھا۔

عائلہ کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے ریشمی بال سمیٹتی' بیڈ سے اتری' وہ بہت دیر تک سوتی رہی تھی تب ہی اسے ہلکی ہلکی بھوک کا احساس بھی ہورہا تھا۔

کمرے کی ساری لائٹس آن کرنے کے بعد' وہ باہر لاؤنج میں آئی تو سدید ٹی وی دیکھ رہا تھا جبکہ کرنل صاحب اب وہاں موجود نہیں تھے' وہ اسی کے پاس آبیٹھی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام' اٹھ گئیں تم؟'' فوراً سے پیشتر ٹی وی کا والیم کم کرتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

عائلہ نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلایا۔

''طبیعت ٹھیک ہے؟''

''ہوں۔''

''گڈ' کھانا کھاؤ گی۔''

''ہوں۔''

''لگتا ہے اب زبان پر انفکشن ہوگیا ہے۔'' ہلکی سی چپت اس کے سر پر رسید کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور عائلہ ست سی وہیں بیٹھی رہی۔

''یہ لو' مستقبل کے شہید کے ہاتھوں کا بنا کھانا کھا کر دیکھو' روح خوش ہوجائے گی کھا کر۔'' اگلے پانچ منٹ کے بعد ہی وہ کھانے کی ٹرے اٹھا کر لے آیا تو عائلہ اٹھ کر ہاتھ منہ دھو آئی۔

جب تک وہ کھانا کھاتی رہی سدید خاموشی سے اسے گاہے بگاہے دیکھتا رہا' پھر جیسے ہی اس نے کھانا ختم کرکے پانی کا گلاس اٹھایا سدید نے اسے روک دیا۔

''کتنی بار کہا ہے عائلہ' کھانا ختم کرنے کے فوری بعد پانی نہیں پیتے۔''

''ہوں' اگر سالن میں مرچیں تیز نہ ہوں تو۔''

"تم کہنا چاہتی ہو کہ کھانا اچھا نہیں پکا۔"

"جی ہاں۔"

"بس...... ناشکری ہی رہنا ہمیشہ۔" وہ خفا ہوا' عائلہ مسکرادی۔

"بابا کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں۔"

"کیوں؟"

"کیا مطلب کیوں؟ رات کے ساڑھے گیارہ ہورہے ہیں' اس وقت اپنے کمرے میں نہیں جائیں گے تو اور کہاں جائیں گے؟"

"اوہ...... مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اتنا ٹائم ہوگیا۔"

"ہو بھی کیسے سکتا تھا' سارے گدھے گھوڑے بیچ کر جو سوئی تھیں' خیر وہ صمید انکل کئی بار تمہارا پوچھ چکے ہیں' کیا تم ان سے ناراض ہو کر آئی تھیں؟"

"نہیں۔"

"جھوٹ؟" اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ عائلہ نے نظریں چرالیں۔

"میری واقعی ان سے کوئی ناراضگی نہیں ہے سدید۔"

"کوئی ناراضگی نہیں تو وہ اتنے پریشان کیوں ہیں اور تم اتنی رو کر کیوں آئی ہو وہاں سے' مجھے بتاؤ پلیز کیا بات ہے؟" اب وہ سختی سے پیش آرہا تھا' عائلہ جانتی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تبھی یوں بے چین ہو رہا تھا' وہ خود بھی تو اس سے کوئی بات نہیں چھپا سکتی تھی۔ تبھی آہستہ آہستہ سر جھکا گئی تھی۔

"میں صمید انکل سے ناراض نہیں ہوں' نہ ہی آج تک کبھی مجھے ان سے کوئی شکایت ہوئی ہے مگر...... ان کا بیٹا ان جیسا نہیں ہے سدید' پتہ نہیں کیوں وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ بات بات پر مجھے بے عزت کرنا اس نے جیسے اپنا وطیرہ بنالیا ہے' میں اب تک صمید انکل کی وجہ سے بہت کچھ برداشت کرتی رہی ہوں مگر اب نہیں' روز روز اس شخص کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہوسکتی میں......" اسے بتاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر وہ رو پڑی تھی۔

سدید کی جان پر بن آئی۔

"کیا کہا ہے اس نے تم سے؟"

"کچھ نہیں' بس وہ چاہتا ہے کہ میں صمید انکل اور ان کی فیملی سے دور رہوں۔"

"ہوں...... تو تم نے کیا سوچا ہے پھر؟"

"میں ایسا نہیں کرسکتی سدید' صمید انکل کے مجھ پر بہت احسان ہیں' ان کی فیملی نے مجھے بہت پیار دیا ہے' میں اس بددماغ' ذہنی مریض شخص کے لیے اتنے پیارے لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ٹھیک ہے' مگر یاد رکھنا' دوبارہ اگر کسی بھی وجہ سے میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو سچ کہتا ہوں عائلہ' میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" وہ ایسا ہی تھا ٹوٹ کر چاہنے والا۔

عائلہ بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرادی۔

"اچھا...... اور جو خود ہر وقت رلاتے رہتے ہو...... وہ؟" اسے مسکراتے دیکھ کر وہ قدرے ریلیکس ہوا۔

"میری خیر ہے۔"

"چیٹر (بے ایمان......)" کھل کر مسکراتے ہوئے اس نے سدید کے بازو پر زوردار مکا رسید کیا جواب میں وہ اس کی ناک دباتے ہوئے خود بھی مسکرادیا۔



محبت ہے
جبھی تو کچھ بھی کہتے ہو
تمہاری سرد مہری کے سمندر میں
پڑے چپ چاپ سہتے ہیں
محبت ہے جبھی تو ہم
پرندوں کی طرح سے لوٹ آتے ہیں
تمہاری ذات کے گنجان برگد میں
جہاں پر کوئی بھی ٹہنی
ہماری خواہشوں کو گھونسلہ رکھنے نہیں دیتی
محبت ہے جبھی تو ہم نے تیری یاد کا جگنو
حسیں رو پہلے چہروں کی ضیاء میں آج تک کھویا نہیں
جبھی تو ہم دیے کی طرح جلتے ہیں، سلگتے ہیں
تمہاری ہجر کی تاریک راہوں میں سنوں جاناں
ہماری خاک کو گر تم ہواؤں میں اڑاؤ گے
تو واپس لوٹ آئیں گے
کہ...... ہمیں تو خاک ہو کر بھی تیرے قدموں میں رہنا ہے!

رات وہ خاصی دیر سے گھر واپس آیا تھا۔

پریہان اپنی ساری مصروفیات ترک کیے اس کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھی وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

صمید صاحب بھی ابھی تک جاگ رہے تھے' مگر اس وقت وہ کسی طور زاویار سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے تبھی ان کی ایماء پر پریہان اٹھ کر اس کے کمرے میں آئی تھی' جو کمرے سے ملحقہ واش روم میں گھسا منہ پر پانی کے چھپاکے مار رہا تھا۔

"زاویار بھائی' کھانا لاؤں؟"

"نہیں...... بھوک نہیں ہے۔" چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اس نے چہرہ خشک تولیے سے رگڑا۔ بلیک شرٹ کی آستین بھی کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی تھی' وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ٹھیک ہے مگر ایک کپ کافی تو پی سکتے ہیں ناں میرے ساتھ؟"

"ہوں...... ضرور۔" چہرہ خشک کرنے کے بعد تولیہ اس نے سائیڈ میں صوفے پر پھینک دیا تھا۔ پریہان مطمئن سی دوبارہ نیچے چلی آئی' تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں اپنا اپنا کافی کا مگ ہاتھ میں لیے باہر لان سے ملحقہ سیڑھیوں پر آ بیٹھے تھے۔

"تم کہنا چاہتی ہو کہ کھانا اچھا نہیں پکا۔"
"جی ہاں۔"
"بس...... ناشکری ہی رہنا ہمیشہ۔" وہ خفا ہوا عائلہ مسکرا دی۔
"بابا کہاں ہیں؟"
"اپنے کمرے میں۔"
"کیوں؟"
"کیا مطلب کیوں؟ رات کے ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں اس وقت اپنے کمرے میں نہیں جائیں گے تو اور کہاں جائیں گے؟"
"اوہ...... مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اتنا ٹائم ہوگیا۔"
"ہو بھی کیسے سکتا تھا' سارے گدھے گھوڑے بیچ کر جو سوئی تھیں' خیر وہ صمید انکل کئی بار تمہارا پوچھ چکے ہیں' کیا تم ان سے ناراض ہو کر آئی تھیں؟"
"نہیں۔"
"جھوٹ؟" اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ عائلہ نے نظریں چرا لیں۔
"میری واقعی ان سے کوئی ناراضگی نہیں ہے سدید۔"
"کوئی ناراضگی نہیں تو وہ اتنے پریشان کیوں ہیں اور تم اتنی رو کر کیوں آئی ہو وہاں سے' مجھے بتاؤ پلیز کیا بات ہے؟" اب وہ سختی سے پیش آ رہا تھا' عائلہ جانتی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تبھی یوں بے چین ہو رہا تھا' وہ خود بھی تو اس سے کوئی بات نہیں چھپا سکتی تھی۔ تبھی آہستہ آہستہ سر جھکا گئی تھی۔
"میں صمید انکل سے ناراض نہیں ہوں' نہ ہی آج تک کبھی مجھے ان سے کوئی شکایت ہوئی ہے مگر...... ان کا بیٹا ان جیسا نہیں ہے سدید' پتہ نہیں کیوں وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ بات بات پر مجھے بے عزت کرنا اس نے جیسے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے' میں اب تک صمید انکل کی وجہ سے بہت کچھ برداشت کرتی رہی ہوں مگر اب نہیں' روز روز اس شخص کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہو سکتی میں......" اسے بتاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر وہ رو پڑی تھی۔
سدید کی جان پر بن آئی۔
"کیا کہا ہے اس نے تم سے؟"
"کچھ نہیں' بس وہ چاہتا ہے کہ میں صمید انکل اور ان کی فیملی سے دور رہوں۔"
"ہوں...... تو تم نے کیا سوچا ہے پھر؟"
"میں ایسا نہیں کر سکتی سدید' صمید انکل کے مجھ پر بہت احسان ہیں' ان کی فیملی نے مجھے بہت پیار دیا ہے' میں اس بد دماغ' ذہنی مریض شخص کے لیے اتنے پیارے لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔"
"ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا' دوبارہ اگر کسی بھی وجہ سے میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو سچ کہتا ہوں عائلہ' میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" وہ ایسا ہی تھا ٹوٹ کر چاہنے والا۔
عائلہ بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دی۔
"اچھا...... اور جو خود ہر وقت رلاتے رہتے ہو...... وہ؟" اسے مسکراتے دیکھ کر وہ قدرے ریلکس ہوا۔
"میری خیر ہے۔"

"چیٹر (بے ایمان......)" کھل کر مسکراتے ہوئے اس نے سدید کے بازو پر زوردار مکا رسید کیا جواب میں وہ اس کی ناک دباتے ہوئے خود بھی مسکرا دیا۔



محبت ہے
جبھی تو کچھ بھی کہتے ہو
تمہاری سرد مہری کے سمندر میں
پڑے چپ چاپ سہتے ہیں
محبت ہے جبھی تو ہم
پرندوں کی طرح سے لوٹ آتے ہیں
تمہاری ذات کے گنجان برگد میں
جہاں پر کوئی بھی ٹہنی
ہماری خواہشوں کو گھونسلہ رکھنے نہیں دیتی
محبت ہے جبھی تو ہم نے تیری یاد کا جگنو
حسیں روپہلے چہروں کی ضیاء میں آج تک کھویا نہیں
جبھی تو ہم دیے کی طرح جلتے ہیں' سلگتے ہیں
تمہاری ہجر کی تاریک راہوں میں سنوں جاناں
ہماری خاک کو گر تم ہواؤں میں اڑاؤ گے
تو واپس لوٹ آئیں گے
کہ...... ہمیں تو خاک ہو کر بھی تیرے قدموں میں رہنا ہے!

رات وہ خاصی دیر سے گھر واپس آیا تھا۔
پریہان اپنی ساری مصروفیات ترک کیے' اس کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھی وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
صمید صاحب بھی ابھی تک جاگ رہے تھے' مگر اس وقت وہ کسی طور زاویار سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے' تبھی ان کی ایماء پر پریہان اٹھ کر اس کے کمرے میں آئی تھی' جو کمرے سے ملحقہ واش روم میں گھسا' منہ پر پانی کے چھپاکے مار رہا تھا۔
"زاویار بھائی' کھانا لاؤں؟"
"نہیں...... بھوک نہیں ہے۔" چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اس نے چہرہ خشک تولیے سے رگڑا۔ بلیک شرٹ کی آستین بھی کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی تھی' وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
"ٹھیک ہے مگر ایک کپ کافی تو پی سکتے ہیں ناں میرے ساتھ؟"
"ہوں...... ضرور۔" چہرہ خشک کرنے کے بعد تولیہ اس نے سائیڈ میں صوفے پر پھینک دیا تھا۔ پریہان مطمئن سی دوبارہ نیچے چلی آئی' تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں اپنا اپنا کافی کا مگ ہاتھ میں لیے باہر لان سے ملحقہ سیڑھیوں پر آ بیٹھے تھے۔

''میں جانتی ہوں اس وقت آپ بہت ڈس ہارٹ ہیں' یقیناً پاپا سے ناراض بھی' ہے ناں؟'' کچھ دیر خاموشی کے بعد پریہان نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

زاویار نے جواب میں ایک بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارا۔

''نہیں۔''

''جھوٹ مت بولیں۔''

''جھوٹ نہیں بول رہا میں' اور میرے خیال سے نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے۔''

''اوکے' تو کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اتنی رات کو بنا کسی وجہ کے آپ گھر سے باہر کہاں مصروف تھے؟''

''ہوں...... اپنے ایک دوست کی طرف گیا تھا' امریکہ کا ٹکٹ کنفرم کروانے۔''

''وہاٹ...... مگر کیوں؟'' جتنے سکون سے اس نے اطلاع دی تھی وہ اتنی ہی بے چین ہوگئی تھی۔

زاویار نے ایک اور بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارا۔

''کیونکہ میری یہاں ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' فوراً رخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے اس نے پوچھا مگر زاویار نے جواب نہیں دیا۔

''ایک بات پوچھوں بھائی؟'' کچھ پل خاموشی کے بعد پھر اس نے پوچھا۔ وہ محض سر ہلا سکا۔

''ہوں۔''

''آپ عائلہ علوی سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟'' سوال خاصا غیر متوقع تھا۔ اس کی پیشانی کے بلوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''بہتر ہوگا پریہان اگر ہم اس لڑکی کے ٹاپک پر کوئی بات نہ کریں' پلیز۔''

''اوکے' مگر میں آپ کے یوں اچانک امریکہ واپس جانے کی وجہ ضرور جاننا چاہوں گی۔''

''کوئی وجہ نہیں ہے۔'' اس نے جیسے کچھ بھی نہ بتانے کی قسم کھا رکھی تھی۔

''چلو اب سو جاؤ' رات بہت ہوگئی ہے۔'' اچانک وہ اس کے پہلو سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا تو وہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

زاویار نے کمرے میں واپس آنے کے بعد دروازہ لاک کیا' تھوڑی دیر کے بعد جولی رابرٹ اس کے ساتھ اسکائپ پر آن لائن تھی۔

''کیسے ہو زی؟''

''فائن' تم سناؤ' ایبک کہاں ہے؟''

''کل تک تو یہیں تھا' آج صبح شکاگو گیا ہے' کچھ کام تھا' تم تھوڑے پریشان لگ رہے ہو' کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں' بس میں امریکہ واپس آ رہا ہوں۔''

''خیریت......؟''

''ہوں...... خیریت ہی ہے۔''

''مگر تم تو کہہ رہے تھے' تمہارے بابا کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''غلط فہمی تھی میری' ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ وہاں تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری بہن ان کی مدد کر رہی ہے؟''

"نہیں۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں آ رہے ہو؟"

"تمہیں کوئی مسئلہ ہے میرے واپس آنے سے؟" ایک دم سے وہ بھڑک اٹھا تو جولی کھل کر ہنس دی۔

"نہیں...... مگر میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی فرسٹریشن ضرور شیئر کرو۔"

"کوئی فرسٹریشن نہیں ہے۔"

"کم آن زاویار...... میں بہت سالوں سے تمہیں جانتی ہوں اور بہت اچھی طرح سے مجھے اس بات کا پتہ ہے کہ تم کوئی بھی فیصلہ یوں اچانک نہیں کرتے۔" وہ ابھی بھی مسکرا رہی تھی' زاویار نے جیسے تھک کر سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دیا اور پھر تھوڑی دیر بعد نا چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی ساری الجھن اس کے ساتھ شیئر کر چکا تھا۔

"ہوں...... اگر ایسی بات ہے تو پھر تمہیں ہر صورت وہیں رہنا چاہیے۔ کیا تم ایک اجنبی لڑکی کو اپنے پاپا کے بزنس پر آسانی سے ہاتھ صاف کرنے دو گے؟"

"میرا پاپا کے بزنس پر کوئی حق نہیں ہے جولی' وہ لڑکی انہیں مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔"

"ایسے مت کہو زاویار...... تم ان مڈل کلاس لڑکیوں کی حقیقت نہیں جانتے' بہت چالاک ہوتی ہیں یہ اپنے مفاد کے لیے کسی کو بھی ہاتھ میں کر لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا ان کے لیے۔"

"تو......؟"

"تو یہ کہ تم اپنے بابا کا بزنس خود اپنے ہاتھ میں لو' ان کا اعتبار جیتو اور آہستہ آہستہ اس لڑکی کا پتہ صاف کر کے سارا بزنس یہاں امریکہ میں منتقل کر لو آفٹر آل یہ تمہاری خواہش بھی ہے۔"

"ہوں...... میرا خیال ہے یہ ایک بہترین مشورہ ہے۔"

"یقیناً ویسے بھی میدان جنگ سے بھاگنا بزدلوں کا کام ہے اور تم بزدل نہیں ہو۔"

"تھینکس جولی' ایک مرتبہ پھر تم نے میری مشکل آسان کر دی۔" وہ اب مسکرا رہا تھا' جولی بھی مسکرا دی۔

"یو آل ویز ویلکم سر۔" تھوڑی دیر مزید ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے سسٹم آف کر دیا' یقیناً جولی نے اسے صحیح بات سمجھائی تھی' واقعی وہ لڑکی اپنے حالات بدلنے کے لیے اس کے گھر والوں کی محبت کیش کر رہی تھی' مگر وہ اب اسے ایسا کوئی موقع نہیں دینے والا تھا۔



زاویار صمید حسن کے کمرے کی لائیٹ جل رہی تھی۔

صمید صاحب نے پریہان سے اس کا امریکہ واپسی کا ارادہ جان کر چپ سادھ لی' وہ صرف شکل و صورت میں اپنی ماں پر نہیں گیا تھا بلکہ اس نے عادتیں اور مزاج بھی اسی کا چرایا تھا۔

پریہان اپنے کمرے میں جا چکی تھی' وہ تھکے تھکے سے باہر لان میں چلے آئے جہاں ایک کونے میں مدھم سا جلتا دودھیا بلب بے حد اداس دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جہاں زاویار اور پریہان بیٹھے تھے وہ بھی وہیں بیٹھ گئے۔

رات کی سرد خاموش ہوا ایک دم سے انہیں بے کل کر گئی تھی۔

خیر اور شر کی کرنیں بکھیرتا چاند اب بادلوں سے آنکھ مچولی کر رہا تھا' وہ نڈھال سے پلر سے ٹیک لگا کر پلکیں موند گئے' گزرے ہوئے وقت کی یادوں کا ریلا پھر انہیں بہانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ کتنے سال ہو گئے تھے مگر...... آج بھی بیتی

ہوئی یادوں کے زخم تازہ تھے۔

یادوں کا چڑھتا دریا کسی طور خشک ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

کیا نہیں تھا آج ان کے پاس؟

عزت...... دولت...... شہرت......

مگر پھر بھی تشنگی تھی کہ کسی طور ختم ہوتی دکھائی نہ دے رہی تھی' کسی ضدی بچے کی طرح آج بھی ان کا دل اسی آنگن میں پناہ ڈھونڈنا چاہتا تھا' جہاں کبھی مریا رحمٰن سے ان کی محبت پروان چڑھی تھی۔

وہ محبت...... جس نے ہجر کا روپ دھار کر پھر ان کا ماس تک کھا لیا تھا...... ٹک...... ٹک...... ٹک...... گھڑی کی سوئیاں آگے ہی آگے سفر کرتی جا رہی تھیں' مگر وہ اور ان کا دل پیچھے جا رہے تھے' گزرے ہوئے ان سالوں کی طرف جو صدیوں پر محیط ہو کر انہیں اندر سے ختم کرتے جا رہے تھے۔

مریا رحمٰن ان دنوں بہت خوش تھی۔

روز صبح کالج جاتے ہوئے وہ اس کے خوب کان کھاتی تھی اب وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا بھی بے حد خیال رکھنے لگی تھی۔ شیر علی صاحب اور بریرا بھی اس سے بہت خوش تھے کہ اس نے ان کی بات کا مان رکھ لیا تھا۔

انہی دنوں بریرہ کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی جو بھی چیز کھاتی فوراً واپس الٹ دیتی۔ اس روز سنڈے تھا اور مریا شیر علی صاحب کے حکم پر زبردستی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں دونوں کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

وہ امید سے تھی اور اس کے حمل کو تیسرا مہینہ لگ چکا تھا۔

شیر علی صاحب کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ فوراً سمندر پار بیٹھے سکندر علوی کو بھی اطلاع دی گئی' بہت دنوں کے بعد صمید نے اس گھر میں خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے جگنو ٹمٹماتے دیکھے تھے۔

مریا کی مصروفیات بڑھ چکی تھیں۔

اس نے بریرہ کو مکمل ریسٹ دینے کے لیے خود کو کولہو کا بیل بنا لیا تھا۔ رات میں سب کاموں سے فارغ ہو کر پڑھنے بیٹھتی تو نیند اس کے اعصاب پر تسلط جما لیتی' اور وہ کبھی کمرے میں' کبھی صحن میں اور کبھی لاؤنج میں ہی بیٹھی بیٹھی سو جاتی۔

صمید کو اس پر بے حد ترس آتا تھا۔ بے پناہ کشش کی حامل وہ پیاری سی لڑکی رشتوں پر قربان ہو رہی تھی' بہت اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس رات بھی جب وہ ٹیوشن سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا تو وہ باہر صحن میں پڑھتے پڑھتے' کتابوں پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ صمید اپنے کمرے کی طرف بڑھتے بڑھتے اچانک رک گیا تھا۔ باہر صحن میں سرد ہوا کے تھپیڑے اسے نقصان پہنچا سکتے تھے' جبکہ اس نے کوئی شال لے رکھی تھی نہ ہی سویٹر پہن رکھا تھا' بریرہ اور شیر علی صاحب شاید سو چکے تھے اسے تھوڑا کام تھا لہٰذا وہ تھوڑا لیٹ ہو گیا تھا اور اب گیٹ کی ایکسٹرا چابی سے لاک کھول کر بنا کسی کو ڈسٹرب کیے اندر چلا آیا تھا' تاہم صحن میں موجود مریا نے اسے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ کچھ دیر پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے اسے پکارا تھا۔

"مریا۔" اور وہ جو سدا سے نیند کی کچی تھی' اس کی پکار پر فوراً جاگ گئی۔

"ہوں۔"

"اندر چلو' یہاں بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔"

"نہیں...... مجھے ابھی پڑھنا ہے میرا ٹیسٹ ہے کل۔"

''ایسے پڑھتے ہیں سوکر؟'' بناءاس کی آنکھوں کی سرخی نوٹ کیے اس نے خفیف سا طنز کیا' وہ سر جھکا گئی۔

''سوری ..... مجھے پتہ ہی نہیں چلا کب آنکھ لگ گئی۔''

''اسی لیے کہہ رہا ہوں' ابھی سوجاؤ' صبح اٹھ کر پڑھ لینا۔''

''نہیں..... صبح نہیں پڑھ سکتی' صبح مجھے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔''

''آپ کی مرضی..... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ پلٹا تھا جب اس نے بتایا۔

''آج کلاس میں میری بہت انسلٹ ہوئی۔''

''ہونی ہی تھی..... سارا دن کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کاموں میں جتی رہوگی تو پڑھائی تو متاثر ہوگی' اوپر سے زبردستی جاگ جاگ کر صحت کا بیڑا غرق بھی کررہی ہو۔''

''آپ میری صحت کی ٹینشن نہ لیں' میں ابھی بس تھوڑی دیر میں سوجاؤں گی۔'' بناء اس کی نصیحت پر کان دھرے اس نے قطعیت سے کہا تو وہ کندھے اچکا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے روز صبح ناشتے کی میز پر کرنل شیر علی اس سے کہہ رہے تھے۔

''صمید بیٹا' کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم رات میں ٹیوشن سے ذرا جلدی گھر واپس آجایا کرو۔''

''ہوسکتا ہے انکل' ٹیوشن سے تو میں عموماً جلدی فارغ ہوجاتا ہوں' پھر کوئی نہ کوئی دوست ساتھ گھسیٹ لیتا ہے' آپ حکم کریں۔''

''حکم کیا کرنا ہے' درخواست ہے' جلدی گھر واپس آجایا کرو تو تھوڑی دیر مریرا کو ٹیوشن دے دیا کرو' بریرہ کے خیال میں اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہورہا ہے۔''

''ٹھیک ہے انکل..... آپ کا ہر حکم میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتا ہے' میں پڑھا دیا کروں گا۔''

''شاباش..... مجھے تم سے ایسی ہی سعادت مندی کی امید تھی۔'' وہ خوش ہوئے تھے' جواب میں صمید حسن نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگالیے۔

......☆☆☆......

اس روز مریرا کا ٹیوشن کے لیے پہلا دن تھا۔

کالج سے واپسی کے بعد اس نے روزمرہ کے تمام امور تندہی سے انجام دیئے اور کتابیں لے کر سرِ شام ہی صحن میں آبیٹھی' صمید گھر واپس آیا تو اسی نے اسے گرم کھانا اور چائے مہیا کی' کرنل صاحب کی بیماری اور بریرہ کی پریگنینسی کے بعد ان دونوں کا کھانا علیحدہ پکتا تھا' جسے وہ وقت پر پہلے ہی کھالیتے تھے۔ مریرا بھی اکثر بریرا کے ساتھ ہی کھالیتی اور صمید کی گھر واپسی پر اس کا کھانا گرم کردیتی۔

اس روز وہ بہت تھکا ہوا تھا' اسی لیے زیادہ دیر نہ پڑھا سکا' تاہم مریرا اس کے لیے بے حد محنتی اور ذہین طالبہ ثابت ہوئی تھی۔ ذہین بریرہ بھی بہت تھی مگر شادی کے بعد اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ صمید مریرا کو ایک بار سرسری سے انداز میں بھی جو چیز سمجھا دیتا تھا وہ اسے کبھی نہیں بھولتی تھی۔ چند ہفتے اسی مصروفیت کی نذر ہوگئے تھے' تب ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت چپ چپ سی رہنے لگی تھی۔

کام کاج سے فارغ ہوکر یا تو کرنل صاحب کے کمرے میں گھسی رہتی یا پھر بریرہ کے پاس ٹیوشن کے ٹائم بھی اس کا سر زیادہ دیر جھکا ہی رہتا تھا۔ بہت کم وہ صمید کی طرف دیکھ کر بات کرتی تھی۔ اس روز بھی گھر واپسی کے بعد فریش ہوکر وہ باہر صحن میں بیٹھا تھا' جب وہ گرم شال میں لپٹی' کتابیں سینے سے لگائے اس کے مقابل آبیٹھی۔

عاصمہ نور

پیارے آنچل کے پیارے قارئین اور اسٹاف کو میرا محبت بھرا اسلام قبول ہو۔ مجھے عاصمہ نذر کہتے ہیں لیکن شوقیہ عاصمہ نور ہے' میرا تعلق مخدوم پور کے چھوٹے سے گاؤں اسٹیشن جان محمد والا سے ہے۔ میری پیدائش 18 جولائی 1999ء کو ہوئی' نہم کلاس کی طالبہ ہوں اور بچپن سے آنچل کا مطالعہ کرتی ہوں۔ جی تو قارئین اب بات ہوجائے پسند ناپسند کی تو وصی شاہ' فراز اور نازیہ کنول کی غزلیں بے حد پسند ہیں' آنچل بے حد پسند ہے' ہر کوئی ڈانٹتا ہے اتنی چھوٹی سی عمر میں ڈائجسٹ نہ پڑھا کرو لیکن میں آنچل کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ''مجھے ہے حکم اذاں'' کہانی بہت پسند تھی' جواب ختم ہوگئی۔ خامی یہ ہے کہ غصہ بہت کرتی ہوں' میری دوست ایمان فاطمہ کے مطابق خامی یہ ہے کہ بولتی بہت کم ہوں اور خوبی میری آپی ثمینہ کے کہنے کے مطابق محنت کرتی ہوں۔ پھول بے حد پسند ہیں' پسندیدہ ٹیچر شاہ پارہ اور راحیلہ ہیں' ٹیچر راحیلہ سے ڈر بہت لگتا ہے لیکن ان کو بہت لائک کرتی ہوں اور ٹیچر شاہ پارہ کی پرسنالٹی کو بہت لائک کرتی ہوں۔ پسندیدہ دوست ایمان جس سے دل کی ہر بات شیئر کرلیتی ہوں۔ ڈاکٹر بننا اور ڈیجیٹل کیمرہ لینا میری زندگی کی سب سے بڑی وشز ہیں' دعا کریں کہ پوری ہوجائیں۔ پسندیدہ کلر پنک اور وائٹ ہیں' پسندیدہ شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے پیارے بابا جان ہیں جن سے بے حد پیار کرتی ہوں' اللہ ان کا سایہ ہمیشہ ہم پر قائم رکھے آمین۔ میں چاہتی ہوں میں کوئی اتنا اچھا کام کروں کہ میرے ماں باپ اور ٹیچرز کا سر فخر سے بلند ہوجائے۔ میری زندگی کا دارومدار تھوڑے سے لوگوں پر گھومتا ہے۔ میرے ماں باپ' بہن بھائی' میری فرینڈز اور دو ٹیچرز اور میرا پیارا سا بھانجا احسن بلال ان سب سے حد سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ اللہ ان سب کو ہمیشہ خوش رکھے' اللہ آنچل کو اور آنچل کے اسٹاف اور قارئین کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے آمین' پڑھ کر ضرور بتایئے گا میرا تعارف کیسا لگا' فی امان اللہ۔

''کیسا رہا کل کا ٹیسٹ؟'' کتاب اس سے لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔ جب وہ بولی۔

''بہت اچھا۔''

''گڈ..... مجھے یقین تھا تم اپنے استاد کا سر کبھی نیچا نہیں ہونے دوگی۔''

''ہوں..... آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے پڑھائی میں مجھے مدد دینے کی درخواست قبول کرلی' ورنہ شاید میں گھر اور کالج میں بیلنس نہ رکھ پاتی' بہرحال میں وعدہ کرتی ہوں' پڑھائی کے سلسلے میں آپ کو کبھی مجھ سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا' بالکل بھی تنگ نہیں کروں گی میں آپ کو۔'' جھکے سر کے ساتھ ہی وہ وعدہ کررہی تھی' صمید کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔

''اچھی بات ہے' چلو اب کتاب کھولو۔'' مریرا نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل میں کتاب کھول لی۔ اب وہ کتاب پر نظریں جمائے بول رہا تھا' بے حد محنت سے اسے پیچیدہ کلیے سمجھا رہا تھا مگر مریرا کی نظریں کتاب پر نہیں تھیں' جانے ایک دم سے کیا ہوا تھا کہ وہ کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی' وہ پڑھا رہا تھا اور وہ عجیب پاگلوں کی طرح سر اٹھائے یک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی' یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں آنسوؤں سے بھرآئیں۔ یونہی اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹوٹ کر کتاب پر گرا تو صمید چونک گیا' فوراً سے پیشتر کتاب سے نظریں ہٹا کر اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ٹھٹک گیا' شفاف کانچ سی آنکھوں میں صحراؤں سی وحشت لیے وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھتے ہوئے رو رہی تھی۔ صمید کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

''اسے پڑھنا کہتے ہیں؟'' فوراً کھنکھار کر اسے ہوش دلاتے ہوئے اس نے ڈپٹا تو وہ شرمندہ ہوگئی۔

"سوری۔"

"سوری کی بچی...... میں پاگلوں کی طرح ایک گھنٹے سے نان اسٹاپ بولے جارہا ہوں اور تم نے کچھ سنا ہی نہیں۔" وہ برہم ہوا تھا تکلفات کی دیوار بھی اچانک سے گری تھی مریرا نے جلدی سے آنکھیں صاف کرلیں۔

"معاف کردیں پلیز دوبارہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" جھکے سر کے ساتھ کہتی وہ بے حد شرمندہ دکھائی دے رہی تھی صمید نے سر جھٹک کر دوبارہ پڑھانا شروع کردیا۔

......☆☆☆......

اس روز بھی بہت ٹھنڈ تھی۔

صمید ٹیوشن سے فارغ ہوکر آیا تو مریرا کو کچن میں مصروف پایا' جبکہ بریرہ گرم شال اوڑھے صحن میں بیٹھی تھی' شاید مریرا کی طرح اسے بھی رات میں ٹھنڈ کے باوجود صحن میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ صمید نے محسوس کیا تھا' جیسے جیسے اس کی ڈلیوری کے دن قریب آرہے تھے' وہ بہت پریشان رہنا شروع ہوگئی تھی' زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی محصور رہتی' لمبے لمبے وظائف اور نوافل کو اس نے اپنا معمول بنالیا تھا' خاموش طبع تو وہ پہلے ہی بہت تھی اب اور بھی خاموش ہوکر رہ گئی تھی۔ اوپر سے سکندر علوی کی کوئی خیر خبر نہیں تھی' کرنل صاحب بھی اس کے لیے بے حد فکر مند تھے' کئی کئی دن صمید کا اس سے سامنا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت بھی گھر واپسی کے بعد اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ صحن میں اس کے پاس ٹک گیا تھا۔

"السلام علیکم...... کیسی ہیں آپ؟" بریرہ نے اس کے سلام پر چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر جلدی سے آنسو صاف کرلیے۔

"وعلیکم السلام میں ٹھیک ہوں آپ کی پڑھائی اور ٹیوشن کیسی چل رہی ہے؟"

"اے ون...... سکندر صاحب سے کوئی رابطہ ہوا؟"

"نہیں...... بہت دنوں سے ان کی کال نہیں آئی میں نے خود دو تین بار ٹرائی کیا تھا مگر ہر بار ان کا نمبر بند مل رہا تھا۔"

"ہوں...... اللہ خیر کرے گا' آپ پریشان نہ ہوں' میرے ایک دوست کا بھائی امریکا میں رہتا ہے' اسے میں نے سکندر بھائی کا کانٹیکٹ نمبر اور ایڈریس دے دیا ہے' جلد ہی وہ ان سے مل کر ہمیں انفارم کردے گا۔"

"بہت شکریہ صمید بھائی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں۔" وہ مشکور ہوئی تھی صمید نے مسکرا کر بات سمیٹ دی۔

"مریرا کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا جواب میں اسے مریرا کی آنسوؤں سے لبریز نگاہیں یاد آگئیں' کیسی عجیب دیوانگی اور وحشت تھی ان آنکھوں میں کہ وہ اگلے کئی دن تک سکون سے نہیں سو سکا تھا۔

"اچھی جارہی ہے۔" نظریں چراتے ہوئے اسے کہنا پڑا تھا۔ وہ مطمئن ہوگئی' عین اسی پل کچن میں کچھ گرنے کی آواز آئی تھی صمید نے ایک نظر بریرہ کی طرف دیکھا پھر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا ہوا؟" کچن کے فرش پر فرائی پین اور گرم تیل بکھرا پڑا تھا' جبکہ مریرا سہمی ہوئی چڑیا کی طرح سائیڈ پر کھڑی اپنے جلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کی تکلیف برداشت کررہی تھی۔

"کچھ نہیں۔" بنا نظریں اٹھائے اس نے جواب دیا تھا۔ تبھی بریرہ بھی وہیں چلی آئی۔

"او میرے خدا' یہ کیا کیا تم نے؟" ایک نظر پیچھے سلیب پر پڑے کچے کبابوں کی پلیٹ پر ڈالنے کے بعد وہ تیزی سے

غزل

میرا نام لے کر گرفت میں وہ دور ہوگیا
جیسے کوئی جانتا نہ تھا' مشہور ہوگیا
آنکھیں بھیگتی رہی نصیب کی بارش میں
ایسے ہی صحرا ستم بھی عبور ہوگیا
ارے کوئی ابن مریم کو آواز تو دے
قلب ناتواں زخموں سے چُور ہوگیا
جیسے تاریکی میں شمع خورشید ہوتی ہے
ایسے مجھ بے حسیں کے سامنے وہ نُور ہوگیا
یہ قوتِ عشق تھی کہ کہسار شاہ
دو عاشق ملے تو کوہ طور ہوگیا

ثناء کلثوم...... مونہ سیدال

اس کی طرف لپکی تھی۔ پھر جلدی سے پیسٹ نکال کر اس نے اس کے ہاتھ اور جلے ہوئے پاؤں کی انگلیوں پر لگادیا۔

"کئی بار کہا ہے جو کام نہ کرنا آئے مت کیا کرو' مگر تم پر کبھی اثر نہیں ہوتا۔"

پیسٹ لگاتے ہوئے وہ اسے ڈانٹ رہی تھی اور مریرہ سر جھکائے ہونٹ کاٹتے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ صمید نے ایک نظر پیچھے سلیب پر دھری کچے کبابوں کی پلیٹ پر ڈالی پھر مریرا کے جلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کی طرف دیکھا عجیب سے احساسات کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔

اس رات ایک مرتبہ پھر وہ نہیں سو سکا تھا' ہاتھ مریرا کا جلا تھا مگر اس کی تکلیف وہ اپنے دل میں محسوس کررہا تھا۔

❀......❀......❀

بہت سے دن عجیب سی بے کلی کی نذر ہوگئے تھے۔

بریرہ کی طبیعت آج کل خاصی خراب رہنے لگی تھی۔ چلتے چلتے ہانپ جاتی' خون کی کمی بڑھتی جارہی تھی مگر وہ تھی کہ اسے اپنا کوئی خیال ہی نہیں تھا' ڈاکٹرز کے مطابق اس کا کیس بھی خاصا پیچیدہ تھا اور ادھر سکندر علوی نے لاتعلقی کی قسم کھا رکھی تھی۔

کرنل صاحب بہت پریشان رہنے لگے تھے' خود صمید بھی امتحانات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ایسے میں صرف ایک مریرا تھی جو سب کا خیال رکھ رہی تھی۔ صمید کی ذرا سی محنت ہی رنگ لائی اور اس نے فرسٹ ایئر کا امتحان بے حد شاندار نمبروں سے کلیئر کرلیا تھا' جس روز اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا وہ بے حد خوش تھی۔ صمید تھکن سے چور گھر واپس آیا تو وہ اسی کا انتظار کررہی تھی۔

"میرا انعام؟" جیسے ہی وہ صحن میں چارپائی پر آکر بیٹھا' اس نے بے حد استحقاق سے اپنی شفاف ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی اور صمید جانتا تھا کہ وہ اپنا انعام ضرور مانگے گی' تبھی اس کی فرمائش پر مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ادھ کھلی گلاب کی کلی اس کی شفاف ہتھیلی پر رکھ دی۔ مریرا کی آنکھوں میں جیسے ہزاروں جگنوؤں نے بسیرا کرلیا تھا' جگر جگر کرتی روشن نگاہیں اٹھا کر اس نے ایک نظر سامنے بیٹھے صمید حسن کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے اپنے لب گلاب کی

ادھ کھلی کلی پر رکھ دیے۔

''تھینک یو۔'' بے حد محبت سے اس نے کہا اور فوراً کچن میں گھس گئی۔

پچھلے دنوں جلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کے باوجود وہ اس کے سارے کام معمول کی مانند سرانجام دیتی رہی تھی جبکہ صمید نے منع بھی کیا تھا' عجیب لڑکی تھی مگر اس کی خاموش محبت اس سے بھی عجیب تھی۔

اگلے روز اس کے دوست کے بھائی۔ نے اسے سکندر علوی سے متعلق ساری معلومات فراہم کردی تھیں' اس کے بقول سکندر کئی سال سے ایک کلاس فیلو کے عشق میں مبتلا تھا اور بالآخر کچھ روز قبل اس نے وہیں امریکہ میں بنا کسی کا خیال کیے اسی کلاس فیلو کے ساتھ شادی رچالی تھی' یہی وہ واحد وجہ تھی۔ جس نے اسے پاکستان اور اپنے رشتے بھلا رکھے تھے۔

اسے بے حد دکھ ہوا' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے کرنل صاحب اور پل پل انتظار کی سولی پر لٹکتے اس نیم مردہ وجود کو اس حقیقت سے آگاہ کرے جو اس کی راہ دیکھتی پتھر ہو رہی تھی۔ بہت دن کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس روز گھر واپسی پر کرنل صاحب کی تفتیش کے جواب میں اس نے انہیں حقیقت سے آگاہ کردیا تھا۔ تاہم وہ نہیں جانتا تھا کہ بریرہ یہ حقیقت چھپ کر جان لے گی شاید پتہ ہوتا تو کبھی لب نہ کھولتا مگر...... جو لکھ دیا گیا تھا وہ ہو کر ہی رہنا تھا۔

بریرہ علوی کی طبیعت اسی رات بگڑ گئی تھی وہ اور کرنل صاحب اسے ہسپتال لائے تھے جہاں ایک مردہ بیٹے کو جنم دینے کے بعد اس نے بھی ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں' قیامت سی قیامت تھی' کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یوں پل کی پل میں تقدیر ایسا قہر ڈھا سکتی ہے' مریرا تو جیسے پاگل ہوگئی تھی' بہت مشکل سے اس نے اسے سنبھالا تھا' سمندر پار سکندر علوی کو بھی اطلاع دی جاچکی تھی...... مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس موقع پر بھی اس نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوری پاکستان آنے سے معذرت کرلی۔

صمید کے اندر جیسے کوئی نیزہ گڑھ گیا تھا۔ بریرہ کی ناگہانی موت کا درد ہی کم نہیں تھا کہ سکندر نے ایک اور گھاؤ لگا دیا' کرنل صاحب کو آخری وقت تک اس کے آنے کی امید رہی تھی' مگر جیسے ہی بریرہ کے وجود نے مٹی اوڑھی ان کی امید ٹوٹ گئی۔

ہنستا بستا گھر ایک دم سے اجڑ کر رہ گیا تھا۔ کرنل صاحب کمر انشین ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ مریرا کونے کھدروں میں چھپ چھپ کر روتی رہتی اور بریرہ کے ننھے منے شہزادے کے کپڑوں کو چومتی رہتی جو اس نے سی کر رکھے تھے۔ اس روز کرنل صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا' موسم سرما کا اینڈ تھا اور وہ اپنے کمرے میں مطالعے میں مصروف تھا جب مریرا نے اسے کرنل صاحب کا پیغام دیا۔ فوری کتاب بند کر کے وہ ان کے حضور حاضر ہوا جو اپنے کسی شاگرد کیپٹن سے فون پر مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے بات سمیٹی اور فون بند کردیا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام آؤ صمید' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

''خیریت؟''

''ہوں خیریت ہی ہے۔'' ان کے چہرے پر ہلکی سی بشاشت تھی صمید قریب ہی بیٹھ گیا۔

''کیپٹن اسد کا فون تھا' کارگل کے محاذ پر خاصی اہم پیش رفت کی ہے اس نے۔''

''گڈ۔'' وہ بھی خوش ہوا' تبھی وہ بولے۔

''سناؤ آگے کی زندگی کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟''

''کیا سوچنا ہے انکل' فی الحال تو بس پڑھائی چل رہی ہے' اس کے بعد میرا اپنا بزنس کرنے کا ارادہ ہے۔''

مسکان وصی

السلام علیکم! ڈیئر فرینڈز۔ میرا نام مسکان وصی ہے۔ میں بائیس اگست کو سیالکوٹ میں جلوہ افروز ہوئی' میری پسندیدہ رائٹرز عمیرہ احمد' نمرہ احمد اور جو اچھا لکھتی ہیں سب ہی ہیں۔ ظاہر ہے جبھی کا دل چاہتا ہے کچھ اچھا پڑھنے کو ملے میرا بھی...... خیر پسند و ناپسند کچھ خاص نہیں ہے' ریڈ' پنک وائٹ' بلیو' کلر فیورٹ ہے۔ جیولری اور میک اپ کا سارا سامان ہر طرح کی برانڈ اپنے پاس رکھنے کا شوق ہے جبکہ پہننا کچھ خاص نہیں۔ مہندی کا شوق ہے' لگا بھی لیتی ہوں اچھی سی۔ کھانے میں جو کچھ مل جائے کھا لیتی ہوں۔ سوئٹ ڈشنز کچھ خاص پسند نہیں' تھوڑی رومینٹک ہوں۔ میوزک بھی ایسا ہی پسند ہے مگر میں کم ہی سنتی ہوں۔ کتابیں پڑھنا' خریدنا' جمع کرنا شوق ہے' اجازت دیں اس بات کے ساتھ کہ زندگی جو دے وہ لے لو۔ کیسا لگا میرا تعارف ضرور بتایئے گا اور شاہ جی آپ بھی او کے' اللہ آپ کو لمبی عمر اور خوشیاں نصیب کرے' آمین۔ فی امان اللہ

''گڈ...... شادی کے لیے کیا سوچا ہے؟'' فوراً ہی وہ اصل بات کی طرف آگئے تھے۔ صمید کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

''ابھی تو دور دور تک کوئی پلان نہیں ہے' کیوں؟''

''میں مریرا کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہ رہا تھا' بریرہ کے بعد بہت بکھر کر رہ گئی ہے وہ' شادی ہوگی تو ذرا بہل جائے گی۔''

''ہوں' مگر ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔''

''چھوٹی تو ہے' مگر بالغ ہے اور لڑکیوں کی یہی عمر ہوتی ہے شادی کی' میری زندگی کا کیا پتہ' ادھر سکندر کا حال تم نے دیکھ ہی لیا' کیا بنے گا اس کا اگر کسی بھی وقت مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو؟'' وہ صحیح پریشان تھے صمید الجھ کر رہ گیا۔

''ایک دو قابل لڑکے ہیں میری نظر میں مگر...... میں پہلے تمہاری مرضی جاننا چاہ رہا تھا۔ تم کیا کہتے ہو؟'' فوراً ہی گیند اس کی کورٹ میں آگری تھی' وہ اچھا خاصا بوکھلا گیا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل' اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میرے لیے یہ سعادت کی بات ہوگی کہ میں آپ کی خواہش کا مان رکھ سکوں۔''

''شاباش میرے بیٹے' مجھے تم سے ایسی ہی فرمانبرداری کی امید تھی۔'' فوراً اٹھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے وہ بے حد خوش ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف دروازے کے اس پار کھڑی مریرا حسن بھاگ کر اپنے کمرے میں جا چھپی تھی۔



چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق اسی ہفتے ان کی شادی طے پا گئی تھی۔

کرنل صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ خود صمید کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں لگ رہے تھے ایک مریرا تھی جو خوش تو تھی مگر بریرہ کو یاد کر کے اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ کمرے میں آیا تو وہ توقع کے عین مطابق گھٹنوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی صمید دروازہ لاک کرنے کے بعد اس کے مقابل آبیٹھا۔

''السلام علیکم۔'' مریرا نے اس کے سلام پر جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

''وعلیکم السلام۔''

"بریرہ کے لیے اتنا رو رہی ہو یا پھر اس بات پر کہ انکل نے کس نکمے لڑکے کے ساتھ نصیب پھوڑ دیا۔" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ مسکرایا' وہ نظریں جھکا گئی۔

"میں جانتا ہوں تم اسے کبھی بھول نہیں سکتیں' وہ اس قابل تھی بھی نہیں کہ اسے بھلایا جاسکے' مگر کچھ معاملات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے مریرا' خواہ انسان کتنا ہی دیواروں سے سر کیوں نہ مارے اسے صبر کرنا پڑتا ہے' اسی لیے تو اسلام میں صبر کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔"

"صبر ہی تو کرلیا ہے میں نے' ہر رشتے کے لیے۔" وہ بولی تو اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ تبھی صمید نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

"میرے بس میں ہو تو میں کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ آنے دوں مگر...... دکھ اسی بات کا ہے کہ میرے بھی اختیار میں کچھ نہیں ہے' ورنہ جس روز میری وجہ سے تم نے اپنا ہاتھ اور پاؤں جلایا تھا میرا بس نہ چلتا تھا کہ تمہیں ساری عمر کے لیے پھولوں کے بستر پر بٹھا دوں۔"

"بس...... زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایک دم سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے اسے گھورا' وہ حیرانی سے مسکرا دیا۔

"کیسا جھوٹ؟"

"یہ جھوٹ ہی ہے کہ آپ کو میری ذات سے کوئی دل چسپی ہے۔"

"اچھا؟"

"اور نہیں تو کیا' میں نے خود سنا تھا جب بڑے ابو نے آپ سے شادی کی بات کی تھی تو آپ نے کیسے بے نیازی سے کہہ دیا تھا کہ "میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل' اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میرے لیے یہ سعادت کی بات ہوگی کہ میں آپ کی خواہش کا مان رکھ سکوں۔" گویا یہ صرف بڑے ابو کی خواہش کا مان رکھا ہے آپ نے' آپ کے دل کی رضا شامل نہیں تھی اس میں۔" وہ شکوہ کررہی تھی صمید کھل کر ہنس دیا۔

"او گاڈ' اتنی سی بات دل میں رکھی ہوئی ہے تم نے؟"

"تو اور کیا۔"

"پاگل لڑکی ہو تم اور کچھ نہیں۔" مسلسل ہنس کر کہتے ہوئے اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"بہت رومینٹک بندہ ہوں میں...... ٹوٹ کر پیار کرنے والا...... میرے ساتھ زندگی گزارو گی تو میری محبتوں کی شدت کا اندازہ بھی ہوجائے گا' مگر یہ شدتیں میں کسی اور پر کبھی ظاہر نہیں کرسکتا تھا' انکل پر تو بالکل بھی نہیں' کیونکہ جو اعتماد ان جیسے عظیم انسان نے مجھ جیسے لاوارث انسان پر کیا' میں کبھی چاہ کر بھی اپنی کسی معمولی سی کمزوری سے ان کے اعتماد کا خون ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا' بہرحال جذبے اگر سچے ہوں تو ملاپ بھی ہو ہی جاتا ہے' اسی لیے میں نے ان کے حکم کا مان رکھا' کتنا اچھا ہے ناں کہ وہ اس احساس کے ساتھ جئیں کہ میں نے ان کی خواہش کو زیادہ اہمیت دی۔"

"ہوں۔"

"اب تو نہیں روؤ گی ناں؟" اگلے ہی پل اس کی طرف ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

مریرا کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"نہیں۔"

"تھینک یو۔" جذب سے کہتے ہوئے صمید نے اس کے ہاتھ چوم لیے تھے۔ شادی کی پہلی ہی رات وہ بے حد

رومینٹک بندہ ثابت ہوا تھا۔اس کے پیار میں واقعی بے حد شدت اور گہرائی تھی۔



صمید حسن کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی۔
یونیورسٹی کو خیر باد کہنے کے بعد آج کل وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک چھوٹی سی فیکٹری میں شیئر حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا' اسی لیے مریرا اور گھر پر اس کی توجہ قدرے کم ہوگئی تھی جس پر وہ اس سے بے حد خفا تھی۔
اس روز صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔
صمید گرم کمبل میں لپٹا کچھ دیر سکون سے سویا رہا' پھر اٹھ کر واش روم میں گھس گیا' تھوڑی دیر نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد وہ فریش ہوکر کمرے سے باہر آیا تو وہ کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی جبکہ کرنل صاحب ابھی ابھی واک سے لوٹے تھے۔
صمید نے دیکھا وہ بے حد خفا تھی اور ضرورتاً بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی' وہ دل ہی دل میں مسکرادیا۔
اس وقت اسے آفس سے دیر ہورہی تھی تبھی اسے منانے کا ارادہ آفس سے واپسی پر موقوف کردیا تھا۔ تاہم جس وقت وہ کرنل صاحب کو چائے دے کر اسے اس کا کپ پکڑا رہی تھی اس نے شیر علی صاحب سے نظر بچا کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی' جسے مریرا نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ کرنا کام بنادیا۔ تاہم اس چکر میں ذرا سی چائے چھلک کر مریرا کا ہاتھ جلا گئی تھی۔
''سی'' کی ہلکی سی آواز کے ساتھ بمشکل اس نے اپنے آنسو روکے تھے۔
''سوری۔''صمید نے فوراً شرمندہ ہوکر اس کا ہاتھ تھام لیا' پھر خود ہی اٹھ کر کچن سے برنال نکال لایا۔
''آپ اپنا کام کریں' میں خود ہی لگالوں گی۔'' وہ اس سے خفا تھی لہٰذا اس کے ہاتھ سے برنال لے کر کچن سے آگئی' پیچھے وہ پریشان سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔
رات میں آفس سے واپسی کے بعد وہ اس کے لیے بے حد خوب صورت گجرے لایا تھا کیونکہ مریرا کو گجرے بہت پسند تھے' مگر اس وقت اس نے انہیں ایک نظر بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔
رات کے تقریباً گیارہ بجے کا ٹائم تھا اور اسے شدید بھوک لگی تھی۔ کرنل صاحب فون پر کسی افسر کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے' تبھی وہ کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آیا تو مریرا نے کھانا لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔
''بیٹھو۔'' جیسے ہی کھانا رکھ کر وہ پلٹی' اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''مجھے بھوک نہیں ہے۔''
''تو ٹھیک ہے' پھر مجھے بھی بھوک نہیں ہے' لے جاؤ اٹھا کر۔''
''تو کر نہیں لگی ہوئی میں' خود رکھ آؤ جا کر۔'' ابھی تک اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا' وہ مسکرادیا۔
''ابھی تک ناراض ہو؟''
''مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے ناراض ہونے کی۔''
''میں صرف اپنی بات کررہا ہوں ڈیئر مریرا۔'' اب وہ اس کی چوڑیوں سے کھیل رہا تھا۔ مریرا نے خفگی سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال لیا۔
''تو؟''
''تو یہ کہ پلیز معاف کردو آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

غزل

شب چودھویں کی چاند کی
تھی بجھی بجھی سی چاندنی
بڑی مختصر سی وہ رات تھی
میری عادتوں میں شمار تھی
میرا خواب تھا وہ خیال تھا
میری زندگی کا سوال تھا
میری خوشی اس سے منسوب تھی
میں اس کے قدموں کی دھول تھی
بڑی مختصر سی وہ رات تھی
جس میں اذیتیں کمال تھی

راؤ کران بدر...... بالانیو

''کتنے دنوں سے یہی بات کہہ رہے ہیں آپ؟'' اب کے اس کی آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی سی نمی چمکی تھی۔
صمید نے دانتوں تلے لب دبالیے۔
''پرامس......اب جلدی گھر آیا کروں گا اور سارا ٹائم تمہیں دوں گا' خوش؟''
''بہت زیادہ جھوٹے ہیں آپ۔'' وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹا وعدہ کررہا ہے مگر پھر بھی ذرا سا مسکراتے ہوئے اس نے صلح کا پرچم لہرادیا تھا۔ صمید اس کی معصومیت پر کھل کر ہنس دیا۔
اگلی صبح کرنل صاحب واک پر نہیں گئے تھے۔
صمید فریش ہوکر کمرے سے باہر آیا تو جیسے وہ اسی کا انتظار کررہے تھے۔
''السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام! صبح بخیر آؤ میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔''
''خیریت؟''
''ہوں' خیریت ہی ہے' تم سناؤ تمہاری فیکٹری کا کیا بنا؟''
''دس پرسنٹ شیئرز کے لیے کوشش کی تھی' الحمدللہ بات بن گئی اب پے منٹ کرنی ہے۔ کچھ پیسے میرے پاس ہیں' کچھ مزید پیسوں کے لیے ایک دوست سے رابطہ کررہا ہوں' امید ہے یہاں بھی بات بن جائے گی۔''
''ان شاء اللہ...... کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟''
''پانچ لاکھ روپے میرے پاس ہیں' مزید پانچ لاکھ کے لیے کوشش کررہا ہوں۔''
''ہوں' میں نے بریرہ اور مریرا کی شادی کے لیے کچھ پیسے بچا کر رکھے تھے' وہ ابھی تک انہیں استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اچھا ہے وہ پیسے اب تمہارے کام آجائیں گے۔''
''نہیں انکل' اس کی ضرورت نہیں ہے' میں خود کررہا ہوں ناں۔''
''میں نے تم سے اجازت نہیں مانگی' صرف اطلاع دی ہے' ویسے بھی مریرا کی شادی کہیں اور طے ہوجاتی تو اس سے

زیادہ پیسوں کا جہیز بن جاتا' تم سمجھ لو میں تمہیں جہیز کی رقم ہی دے رہا ہوں۔"

"نہیں' میں نہیں لے سکتا' یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"اب تم میری نافرمانی کررہے ہو صمید اور مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"انکل پلیز' میرا ضمیر مجھے اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ میں آپ پر مزید کوئی بوجھ ڈالوں' آپ کے پہلے ہی مجھ پر بہت احسانات ہیں۔"

"ٹھیک ہے' اب میں مزید تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ خفا ہوگئے تھے صمید پریشان ہوکر رہ گیا۔

"انکل پلیز' مجھے اتنی بڑی آزمائش میں مت ڈالیں' پلیز۔"

"اب جاؤ' مجھے لگا تھا شاید تم میرے سگے بیٹے ہو۔" قدرے خفا خفا سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے جب صمید نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"اوکے..... جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا' مگر پلیز مجھ سے ناراض مت ہوں پلیز۔" وہ ان کا فرمانبردار بیٹا تھا اور کرنل صاحب جانتے تھے وہ انہیں کبھی ناراض نہیں کرسکتا' تبھی وہ مسکرائے اور پھر فخریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔



اسے کہنا محبت ایک صحرا ہے.....
اور صحرا میں کبھی بارش نہیں ہوتی.....
اگر بالفرض ہو بھی تو' فقط ایک پل کو ہوتی ہے!
اور اس کے بعد صدیاں خشک سالی میں گزرتی ہیں
اسے کہنا' محبت ایک صحرا ہے
اور صحرا کے سرابوں میں بھٹک جانے کا خدشہ
سب کو رہتا ہے
کبھی پیاسے مسافر جب' سرابوں میں بھٹک جائیں
انہیں رستہ نہیں ملتا
اسے کہنا' محبت ایک صحرا ہے
وفاؤں کے سرابوں سے اٹا صحرا!
محبت کے مسافر گر وفا کے ان سرابوں میں
بھٹک جائیں تو پھر وہ زندگی بھر
ان سرابوں میں ہی رہتے ہیں
کبھی واپس نہیں آتے

درمکنون آج کل ایک نیا پراجیکٹ شروع کررہی تھی۔

اسی سلسلے میں اس روز اس نے وقار الحسن کی گیٹ ٹو گیدر پارٹی میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا۔

آفس ٹائمنگ کے بعد تقریباً شام سات بجے صیام گھر سے تیار ہوکر درمکنون کے گھر پہنچا تو آگے مریا بیگم جیسے اسی کی منتظر بیٹھی تھیں۔

سونیا

السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گی۔ میرے شہر کا نام بورے والہ ہے' میرا نام سونیا ہے لیکن سب پیار سے سونی کہہ کر پکارتے ہیں۔ 10 اپریل 1996ء کو بہار کے ساتھ اس دنیا میں آنکھ کھولی' ہم دو بہن بھائی ہیں' پہلے نمبر پر سونی میڈم' دوسرے پر عاطف۔ اب آتے ہیں خوبیوں اور خامیوں کی طرف' خوبی یہ ہے کہ کسی سے لڑائی جھگڑا بالکل بھی نہیں کرتی اور کافی حد تک خوش مزاج ہوں اور خامی یہ ہے کہ باتونی بہت ہوں' میری دوستوں کی تعداد صرف چار ہے اور میرا دل ان کے بغیر ایک پل بھی نہیں لگتا۔ لباس میں شلوار قمیص' چوڑی دار پاجامہ' لہنگا' فراک لمبا دوپٹہ۔ فیورٹ کلر وائٹ سی گرین' بلو' فیروزی' جیولری میں رنگ بریسلیٹ نازک چین پسند ہے۔ فارغ وقت میں ڈائجسٹ پڑھنا' کھانے میں چاول' سموسہ' برگر' سویٹ ڈش میں کھیر اور گاجر کا حلوہ پسند ہے۔ موسم میں بہار کا موسم پسند ہے اور بارش کی تو دیوانی ہوں۔ رائٹر میں سمیرا شریف طور' نازیہ کنول نازی' اقراء صغیر' سیدہ غزل زیدی' آپی آپ نے کیسے "جھیل کنارہ کنکر" لکھا' سچ میرا تو دل ہی لے لیا آپ نے۔ پسندیدہ پھول گلاب ہے' اگر کوئی مجھ سے دوستی کرنا چاہے تو ویلکم' اللہ حافظ۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام! کیسے ہو صیام؟" اپنے نازک سے دلکش سراپے کی مانند ان کا لہجہ بھی ہمیشہ بہت مشفق ہوتا تھا' وہ مودب سا ان کے قریب ہی ٹک گیا۔

"جی میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟"

"بہت کرم ہے میرے مالک کا' تم سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں الحمدللہ آپ اب آفس نہیں آتیں۔"

"ہوں' بس آج کل طبیعت ساتھ نہیں دے رہی' پھر میں زیادہ یہاں پاکستان میں رہتی بھی نہیں ہوں' خیر مجھے تم سے درمکنون کے بارے میں کچھ بات کرنی تھی۔"

"خیریت؟" وہ چونکا جبکہ اس کا دل پھر سے دھڑک اٹھا۔

مریا بیگم نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں' خیریت ہی ہے' اصل میں' میں درمکنون کی طرف سے بہت پریشان ہوں' پچھلے کچھ دنوں سے بہت چپ ہوکر رہ گئی ہے' کھانا پینا بھی چھوڑ دیا ہے' سارا سارا دن کمرا بند کیے پڑی رہتی ہے' فون بھی آف رہتا ہے' دو بار ڈرائیو کرتے ہوئے اپنا ایکسیڈنٹ بھی کرواچکی ہے' خدا کا شکر ہے کہ کوئی بڑی چوٹ نہیں آئی' ورنہ پتہ نہیں کیا ہوجاتا' میں نے اسے اتنا آزردہ کبھی نہیں دیکھا' اسی لیے میں تم سے جاننا چاہتی ہوں کیا آفس میں ایسی کوئی بات ہوئی ہے' جس کی اس نے اتنی ٹینشن لے رکھی ہے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر کیا وجہ ہے' وہ اتنی کم حوصلہ تو کبھی نہیں رہی۔" وہ ماں تھیں اور بالکل صحیح پریشان تھیں۔

صیام نے ذرا سا رخ پھیر لیا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں' وہ اپنے ذاتی معاملات کسی سے شیئر نہیں کرتیں۔" ابھی اس نے اپنی بات مکمل کی تھی کہ درمکنون اپنے کمرے سے نکل کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی' نیچے ہال میں چلی آئی۔

”چلیں صیام صاحب۔“ بے حد خوب صورت لباس کے ساتھ اس نے فل میک اپ کیا ہوا تھا۔
صیام کی آنکھیں جیسے پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔
”اتنا ہیوی میک اپ کرنے کی کیا ضرورت تھی دری؟“ مریا بیگم کو اس کی تیاری ایک آنکھ نہیں بھائی‘ مگر اسے پروا نہیں تھی۔
”اچھا لگ رہا تھا مما‘ آپ کھانا کھا کر سو جایئے گا‘ میں شاید لیٹ ہو جاؤں۔“
”نہیں‘ مجھے اکیلے کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے۔“
”ٹھیک ہے آپ کی مرضی۔“ بنا کوئی بحث کیے وہ وہاں سے باہر نکل گئی تھی۔
مریا بیگم سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔
”اس کا خیال رکھنا صیام‘ تم میرے لیے صرف ایک ورکر نہیں‘ میرے بیٹے کی طرح ہو‘ میں امید کرتی ہوں کہ تم ہمیشہ میری عزت کا پاس رکھو گے۔“
”کہنے کی ضرورت نہیں ہے میڈم‘ اللہ نے چاہا تو آپ ہمیشہ ہر معاملے میں مجھے ایمان دار ہی پائیں گی۔“
”شکریہ۔“ صیام ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا‘ تبھی ان کے شکریہ پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کی طرف اچھالتے ہوئے وہ خود بھی درمکنون کے پیچھے گھر سے باہر نکل آیا۔
اس کا دل ابھی تک معمول پر نہیں آیا تھا۔
درمکنون کے ملبوس سے اٹھتی خوشبو جیسے اس کے حواس سلب کر رہی تھی۔
بڑی مشکل سے اس کے ہوش ربا سراپے کو نظر انداز کر کے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ وہ بے نیازی سی پلکیں موندے سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکائے‘ کھڑکی سے آتی سرد ہواؤں کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی رہی۔
کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اس نے ایک دم سے آنکھیں کھولی تھیں۔
”ایک سوال پوچھوں آپ سے؟“
”ہوں۔“ وہ چونکا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔
”کیا آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“
”پتہ نہیں۔“ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کوئی سوال بھی پوچھ سکتی ہے تبھی جواب گول کر گیا۔
درمکنون نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی۔
تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ ”وقار ہاؤس“ پہنچ چکے تھے۔ گاڑی سے اترنے کے بعد جس وقت وہ گاڑی پارک کر کے آگے بڑھا‘ درمکنون نے چپکے سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
صیام کو لگا جیسے اس کے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا ہو...... مگر درمکنون نے اس کی حیرانی کی پروا نہیں کی‘ وہ تو شاید اس وقت کسی کی پروا بھی نہیں کر رہی تھی۔



شام ڈھل رہی تھی۔
تھکا تھکا سا آفس سے وہ گھر آیا تو سامنے لاؤنج میں صمید صاحب‘ سارا بیگم اور پریہان کے ساتھ عائلہ علوی بھی موجود تھی۔
زاویار کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”السلام علیکم۔“ ایک کڑی نگاہ عائلہ علوی کے جھکے ہوئے سر پر ڈالنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے وہاں رک کر اپنے سلام کا جواب سننے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ فریش ہو کر کمرے سے نکلا تو صمید صاحب عائلہ سے کہہ رہے تھے۔
”عائلہ بیٹے! اگر زاویار نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“
”اٹس انف پاپا۔“ سیڑھیوں پر اس کے قدم جیسے تھم گئے تھے۔ جبکہ پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ڈھیلے قدموں سے باقی ماندہ سیڑھیاں کراس کرتا وہ ان کے مقابل آ بیٹھا تھا۔
”سوری...... مگر میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا‘ مس عائلہ ہماری ملازم ہیں۔ آپ ان کے ملازم نہیں ہیں جو اس طرح سے معافی مانگ رہے ہیں۔“ صمید حسن صاحب کے الفاظ پر زاویار حسن کے اندر جیسے آگ لگ گئی تھی۔
تبھی سارا بیگم نے اسے ڈانٹا تھا۔
”تم چپ رہو زاویار...... یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔“
”کیوں میرا معاملہ نہیں ہے موم...... پاپا میرے باپ ہیں‘ میں ان کے حوالے اور پہچان کے ساتھ سر اٹھا کر فخر سے چلتا ہوں...... مس عائلہ کیا ہیں؟“ وہ بھڑکا۔ تبھی صمید صاحب آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے سرد لہجے میں بولے۔
”عائلہ میری بیٹی ہے‘ بالکل ویسے ہی جیسے پریہان میری بیٹی ہے۔“
”عائلہ اور پریہان کی کوئی مماثلت نہیں ہے پاپا‘ آپ اس لڑکی کو اس کی اوقات اور ضرورت سے بڑھ کر اہمیت دے رہے ہیں۔“
”اس کی اوقات...... کیا ہے اس کی اوقات؟“ زاویار کے جذباتی ہونے پر صمید صاحب نے بے حد دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔
”میری کیا اوقات ہے‘ ہوں؟ تمہاری...... سارا کی پریہان کی‘ کیا اوقات ہے سب کی؟ کیا ہے ایسا ہمارے پاس جو عائلہ کے پاس نہیں ہے‘ صرف دولت؟ وہ دولت جس نے آج تک کبھی کسی کو سکون نہیں دیا‘ وہ دولت...... جس کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ہاتھ سے ریت کی مانند پھسل جائے...... مت بھولو زاویار کہ تمہارا باپ بھی سدا امیر نہیں تھا۔“
”آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے پاپا‘ ایک پرائی لڑکی کے لیے آپ ہر بار اپنے بیٹے کو ڈس ہارٹ نہیں کر سکتے۔“
”ڈس ہارٹ نہیں کر رہا‘ مگر محتاط ضرور کر رہا ہوں‘ آئندہ تم عائلہ کے لیے کوئی غیر مناسب الفاظ استعمال نہیں کرو گے۔“ صمید صاحب کو غصہ بہت کم آتا تھا مگر جب آتا تو پھر بوڑھے شیر کی مانند دھاڑتے تھے۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہے تھے‘ زاویار کے چہرے پر سرخی بکھر گئی۔
”عائلہ مائی فٹ۔“ شدید غصے میں نفرت بھری ایک نگاہ عائلہ علوی پر ڈالنے کے بعد وہ تن فن کرتا گھر سے نکل گیا تھا‘ پیچھے عائلہ کے آنسو مزید روانی سے بہنے لگے۔
”انکل پلیز...... آپ میری وجہ سے اپنے بیٹے کو ناراض مت کریں۔“
”نہیں عائلہ‘ پاپا نے کچھ غلط نہیں کیا‘ انسانی درجہ بندی کی بنیاد اس کے اچھے اعمال اور کردار پر ہوتی ہے اور تمہارا کردار اور اعمال سب کے سامنے ہیں۔“ پری فوراً اس کی سائیڈ لیتے ہوئے بولی‘ سارا بیگم نے بھی اس کی تائید کی۔
”پری ٹھیک کہہ رہی ہے عائلہ...... تم زاویار کی باتوں کو دل پر مت لینا‘ وہ دل کا برا نہیں ہے۔“
”ہوں...... اور جب تک میں زندہ ہوں‘ کبھی جاب چھوڑنے کا سوچنا بھی مت۔“ صمید صاحب کے لہجے میں بھی اس کے لیے بے پناہ محبت تھی۔

عائلہ نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"میں نے زندگی میں کبھی دولت کو اہم نہیں جانا انکل! میرے پاپا روزرات میں مجھے اپنی اور آپ کی زندگی کی کہانی سنایا کرتے تھے' اکثر دولت کے اتار چڑھاؤ کی کہانیاں بھی سناتے تھے۔ مگر میں نے کبھی انہیں پچھتاتے یا اپنے حالات کا واویلا کرتے نہیں دیکھا' بری ہی سہی مگر وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھے' ہاں مگر کبھی کبھی وہ مجھے اپنے گلے سے لگا کر رو پڑتے تھے' انہیں لگتا تھا جیسے انہوں نے میری زندگی کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے' مگر میں نے ہمیشہ ان کی ہمت بندھائی' انہیں یہ احساس دلایا کہ میرے لیے رشتے دولت سے زیادہ قیمتی ہیں اور آج بھی میری یہی سوچ ہے' میں نے کبھی خود کو کسی سے کمتر نہیں سمجھا' کیونکہ الحمدللہ میرے مالک نے مجھ میں کوئی کمی نہیں رکھی' پورے جسمانی اعضاء کے ساتھ اس نے مجھے شعور کی دولت دی' ہر اچھی اور بری چیز میں فرق سمجھایا' کبھی اپنے سوا کسی کا محتاج نہیں کیا' میں دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی ہوں دنیا کی نظر سے نہیں...... شاید اسی لیے مجھے زاویار صاحب کی نفرت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا' ہاں مگر بنا کسی غلطی کے بار بار سب کے سامنے ان کا عزت نفس مجروح کرنا' میں چاہتے ہوئے بھی برداشت نہیں کر سکتی' کیونکہ شاید میرے اندر کی خوددار لڑکی کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔" اس کا سر جھکا ہوا جبکہ لہجہ بے حد دھیما تھا۔

صمید صاحب پھر سے شرمندہ دکھائی دینے لگے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں بیٹے' مگر ان شاء اللہ آج کے بعد وہ ایسا نہیں کرے گا' میں سمجھادوں گا اسے۔"

"کوئی بات نہیں انکل' جہاں اتنے محبت کرنے والے لوگ موجود ہوں' وہاں کسی ایک فرد کی نفرت سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس بار وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

"خیر اب میں چلوں گی' بابا پریشان ہو رہے ہوں گے' سدید بھی گھر پر نہیں ہے' کسی دوست کی طرف گیا ہوا ہے۔"

"نہیں ہرگز نہیں' کرنل صاحب کو میں فون کر دیتا ہوں' تم آرام سے کھانا کھا کر جانا۔"

"ہوں...... تمہارے انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں' میں ابھی کھانا لگواتی ہوں۔" سارا بیگم روانی سے کہتے ہوئے فوراً کھڑی ہوگئی تھیں۔

"نہیں انکل' بہت دیر ہو جائے گی' پلیز ابھی جانے دیں' میں پھر آ جاؤں گی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" قطعی لہجے میں کہتے وہ فوراً کرنل صاحب کو کال ملانے لگے تھے۔

عائلہ بے بس سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

